تحریک اسلامی: چند اہم مسائل

حسن ترابی سے ایک انٹرویو

ترجمہ: محمد ظہیرالدین بھٹی

ڈاکٹر حسن ترابی' تحریک اسلامی کے ممتاز رہنما ہیں جن کی قیادت میں سوڈان اسلامی نظام کے قیام کے عمل سے گزر رہا ہے۔ ان کی فکر اور خیالات میں تجربے کا سبق بھی ہے۔ حال ہی میں اردن سے اشاعت کا آغاز کرنے والے رسالے' الامہ میں ان کا انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں تحریک کو درپیش اہم مسائل کے حوالے سے انھوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ قارئین کے غوروفکر کے لیے ہم اس کا ترجمہ شائع کر رہے ہیں۔ ان کی رائے سے اتفاق ضروری نہیں ہے۔ انٹرویو لینے والے غسان ابو حسین ہیں۔ (مدیر)

س: اسلام کا سیاسی نظام نظریاتی مرحلے سے گزر کر برسرزمین عمل درآمد کے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔ آپ نے برسراقتدار آنے سے پہلے جو لائحہ عمل بیان کیا تھا' اس میں اور اقتدار میں آنے کے بعد موجودہ صورت حال میں کافی فرق ہے۔ اسی طرح یقیناً موجودہ صورت حال اور آج سے سات سال بعد کی حالت میں بھی فرق ہو گا۔ ایسا کیوں ہے؟

ج: ہم نظری طور پر دین اسلام کو انسان کی انفرادی حیثیت میں یا اجتماعی طور پر اقتدار کے ایوانوں میں' دونوں صورتوں میں پوری زندگی کے لیے ایک عمومی نمونہ قرار دیتے ہیں۔ ہم اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ ہمارے زمانہ قریب میں نفاذ اسلام کا کوئی ایسا عملی کام نہیں ہوا جس کو سامنے رکھ کر ہم اس کی پیروی کر سکیں' اور انھی حالات' آزمایشوں اور تقاضوں سے دوچار ہو کر وہی روش اختیار کریں۔ ایک طرف تو ہمارے سامنے موجودہ زمانے میں نظام اسلامی کے قیام کا کوئی نمونہ نہ تھا' دوسری طرف ہمارے پاس جو تحریری سرمایہ اور کتابیں ہیں وہ عملی میدان میں ہماری راہنمائی سے قاصر ہیں۔ کتابوں کی دنیا ہماری عملی دنیا سے بالکل مختلف ہے۔ ایک پرآزمایش ماحول میں دینی اصولوں کو نافذ کرنے کا کام' عام حالات اور عام ماحول میں نفاذ شریعت سے مختلف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم نے اپنے مطالعے کو عملی صورت دینا چاہی تو ہمیں کئی

دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا' ہمارے کام میں کئی خامیاں رہ گئیں اور ہمارے بہت سے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ ایک معاشرے کو دین پر قائم کرتے وقت عملی طور پر جن حقائق سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ روز مرہ کے حالات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ مسلمانوں نے صدیوں سے اپنی کتابوں کو طاقِ نسیان کی زینت بنا رکھا ہے۔

ہم ایک اسلامی ریاست کے قیام پر ہونے والے عالمی ردعمل کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکے۔ طاغوتی قوتیں اس پر شدید ردعمل کرتی ہیں خواہ اس سے انھیں نقصان نہ بھی پہنچتا ہو اور نہ ہی ان کے مفادات پر ضرب پڑتی ہو۔ ہم ان کے شدید ردعمل پر حیران رہ گئے۔ سامراجی طاقتیں تاریخ کا مسلسل مطالعہ کرتی ہیں اور اسلامی ریاست کے حوالے سے مستقبل کے متوقع خطرات کو مدنظر رکھتی ہیں۔

اب ہم زیادہ سمجھ دار اور معاملہ فہم ہو چکے ہیں۔ دین کے بارے میں ہماری فکر و فہم میں اضافہ ہوا ہے۔ اب ہم قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے اسے سیاست و اقتدار کے تناظر میں سمجھتے ہیں اور تاویلات کی گھاٹیوں سے باآسانی گزر جاتے ہیں۔ ہمارے عوام ہمارے ساتھ ہیں' ان کے دلوں میں جذبہ جہاد و عمل ازسرنو زندہ ہو چکا ہے۔ ان میں مشورے' نصیحت اور خیرخواہی کے صالح جذبات امڈ آئے ہیں۔ ہم نے نصیحت' خیر خواہی اور مشورے کے میدان میں' معاشی میدان سے بھی زیادہ پیش رفت کی ہے۔ عقائد کے لیے مادیت' سیکولرازم سے بڑھ کر خطرناک ہے۔

تجرباتی سطح پر آکر ہمیں معلوم ہوا ہے کہ مالیات اور اقتصادیات کی قدیم فقہی کتابیں' موجودہ دور کی حقیقی صورت حال سے بہت زیادہ پیچھے ہیں۔ ہمیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابھی ہمارے سفر کی ابتدا ہے۔ ہنوز روز اول است۔

ہماری ایک نمایاں کامیابی' پورے معاشرے کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا اور پھر اس تبدیلی کو خواتین کا قبول کرلینا ہے۔ یہ بات تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ نفاذ اسلام سے پہلے ہمارے معاشرے میں بیچاری عورت کو یکسر نظرانداز کیا گیا تھا۔ اگر خدانخواستہ مغرب پرستوں نے اسے اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی ہوتی' اس میں مرد کے خلاف نفرت پیدا کی ہوتی' اس میں تعصبات پیدا کیے ہوتے تو ہمارے لیے بڑی مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔

ہم نے سوڈان میں درپیش تمام رکاوٹوں اور مزاحمتوں کا سامنا اسی جذبے سے کیا ہے جس سے ابتدائے اسلام میں مسلمانوں نے کیا تھا۔ سوڈان میں اسلام کا ایک روایتی سماجی تصور اور پس منظر رہا ہے۔ یہاں اسلام براہ راست نہیں آیا بلکہ صوفیانہ سلسلوں کے ذریعے پہنچا ہے۔ اس کے باوجود ہمارے لیے اس روایتی مذہب پر دین کی عمارت کھڑی کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ہم نے اسلام کی اصل تعلیمات کے ذریعے

روایتی مذہبی بنیادوں کو وسعت سے ہمکنار کر دیا۔

ہمیں یہ بھی اندیشہ تھا کہ خود تحریک اسلامی ہمارے لیے کہیں خطرہ نہ بن جائے۔ ہم مسلم معاشرے میں کسی مخصوص تحریک کی گنجایش نہیں دیکھتے۔ آغاز اسلام میں کوئی مخصوص تحریک نہ تھی۔ آپؐ کے پاس آنے والے وہی ہوتے جو آپؐ کے دین کی طرف مائل ہوتے اور کفر کے ماحول سے بیزار ہو کر بارگاہ رسالتؐ میں پناہ لینے کے لیے بے تاب ہوتے تھے۔ ہمیں خطرہ تھا کہ کہیں تحریک اسلامی دیگر مذہبی گروہی اور صوفیانہ دھڑے بندیوں کی طرح کی ایک عصبیت نہ بن جائے، مگر الحمدللہ، ایسا نہیں ہوا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ سوڈان روایتی طور پر ایک "کھلا ملک" ہے۔ اس میں تمام روایتی فقہی مکاتیب فکر، مذاہب اور سلسلے پائے جاتے ہیں۔ شیعہ، سنی سب یہاں پر رہتے ہیں۔ ہم اس خطرے سے اس لیے بھی محفوظ رہے کہ تحریک اسلامی، الحمدللہ اپنے نام، اپنی قیادت، اپنے طریق کار، سب کو تبدیلیوں کے عمل اور تجربے سے گزرنے دینے کے لیے تیار ہے۔ غرضیکہ ہمارا ملک اور ہماری تحریک دونوں کھلے ہیں۔

ہماری خارجہ پالیسی ابھی تک واضح نہیں ہو سکی۔ اس بارے میں ہمیں وہ نئی باتیں پیش آئیں جو ہمارے گمان میں بھی نہ تھیں۔ ہم نے کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ ہم ایک ایسے صحرا میں جس کے باشندے دین سے بیگانہ ہیں، جن سے اہل مغرب سخت عداوت و کینہ رکھتے ہیں، ہم وہاں ایک نخلستان قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ہم اپنی تحریک کا ناقدانہ نقطہ نظر سے معروضی جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ اپنی تحریک کو جادۂ حق پر قائم رکھنے کے لیے ہم نے عدل و انصاف کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا، خواہ اس سے خود ہم کو ہی نقصان کیوں نہ پہنچتا ہو۔ بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ تحریک سے باہر کے لوگ بھی ہماری نگرانی کریں، ہمارا محاسبہ کریں، ہمارا جائزہ لیں اور ہمارے حق میں اور ہمارے خلاف گواہ ٹھہریں۔

اب تو پوری دنیا سمٹ چکی ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہم سوڈان کے گرد کوئی آہنی دیوار کھڑی کر دیں اور اس کے بعد ہم وہاں نظام اسلام کی کاشت کریں اور جب اسلام کی فصل پک جائے تو پھر ہم اس دیوار کا پھاٹک کھول دیں۔ دین اسلام کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی کارکردگی کو کھلا رکھیں۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ لوگ آئیں، ہماری مدد کے لیے بڑھیں، ہم جو کچھ کر رہے ہیں اسے دیکھیں، ہماری غلطیوں کی نشاندہی کریں جو کچھ کم نہیں ہیں۔ ہماری اچھی باتوں کو سراہیں اور ان سے سبق لیں۔ ہماری اچھی کارکردگی بھی کچھ کم نہیں ہے۔

جب ہم صدرِ اول میں قیام اسلام کے اعلیٰ نمونوں کو دیکھتے ہیں اور پھر اپنی کارکردگی پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں دکھ محسوس ہوتا ہے مگر جب ہم اپنا موازنہ اپنے اردگرد کے مسلم ممالک سے کرتے ہیں تو ہمیں قدرے فخر محسوس ہوتا ہے اور ہم اپنے طے کردہ راستے پر سجدہ شکر بجالاتے ہیں۔

سے ایک بنیاد تو یہ ہے کہ جو ریاست غیر جانب داری کا دعویٰ کرتی ہے وہ اپنی حاکمیت کے تحفظ کا پورا پورا حق رکھتی ہے اور غیر جانب داری کے یہ معنی نہیں لیے جائیں گے کہ اس کی حاکمیت کو نظرانداز کر دیا جائے۔ دوسری بنیاد یہ ہے کہ جو دو متحارب قوتیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں ان کے باہمی حربی معاملات سے یہ غیر جانب دار ریاست مکمل طور پر علیحدہ اور لاتعلق رہے گی۔ دونوں میں سے کوئی فریق اس سے یہ مطالبہ نہیں کر سکتا کہ وہ ان میں سے کسی ایک فریق کی مدد کرے یا اس کو ایسی سہولتیں فراہم کرے جس کا فائدہ اس کو یا اس کا نقصان دوسرے فریق کو پہنچ سکتا ہو۔ یہ وہ دو بنیادیں تھیں جن پر مغرب میں غیر جانب داری کا تصور استوار کیا گیا۔ ان میں سرے سے عدل و انصاف کے تقاضوں کا کوئی ذکر نہیں آتا۔ دونوں متحارب ریاستوں میں کون ظالم ہے اور کون مظلوم، کون حق پر ہے اور کون باطل پر، یہ طے کرنا یا اس بحث میں پڑنا غیر جانب دار ریاست کا درد سر نہیں۔ حالانکہ یہ بلاواسطہ ظالم کی مدد کرنے کے مترادف ہے، جس کے دردناک مناظر آج مسلمان بوسنیا اور چیچنیا میں شب و روز دیکھ رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں (جیسا کہ ہم ابھی دیکھیں گے) قرآن پاک میں جو ہدایات دی گئیں اس میں غیر جانب دار فریقوں کے ساتھ نہ صرف پرامن بقائے باہمی کا اصول دیا گیا بلکہ ان کے ساتھ عدل و انصاف کے عالمگیر ابدی اصول کے مطابق اقدامات کرنے اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے کام کرنے کی ہدایات بھی دی گئیں۔ مزید برآں قرآن پاک کی مشہور اور عام اصطلاح، بِر کے اصول کے مطابق ان سے معاملہ کرنے کی ترغیب بھی دی گئی۔

آج کل غیر جانب داری کے تصور کو ماہرین قانون نے دو قسموں میں تقسیم کیا ہے اور ان کا خیال ہے کہ پہلی بار انھوں نے ہی دنیا کو اس تقسیم سے متعارف کرایا ہے۔ ایک، مکمل غیر جانب داری اور دوسرے، شبہ غیر جانب داری یا نیم غیر جانب داری (quasi - neutrality) جس میں متعلقہ ریاست مکمل طور پر غیر جانب دار نہیں ہوتی، لیکن اس حد تک وہ ضرور غیر جانب دار رہتی ہے کہ وہ کسی ایک فریق کو حربی مدد فراہم نہ کرے۔ اس میں ہر قسم کی حربی مدد شامل ہے چاہے وہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ، اس میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ کسی فریق کی فوج کو گزرگاہ بھی فراہم نہ کرے۔ لیکن اس کے علاوہ دوسری نوعیت کی مدد اور تعاون وہ فراہم کر سکتی ہے، چاہے وہ مدد آگے چل کر حربی اقدامات میں مدد دے۔

جب ہم اسلام کے تصور غیر جانب داری کی بات کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں اس غلط فہمی کا ازالہ کر دینا چاہیے جو بہت سے مغربی مصنفین نے جان بوجھ کر پیدا کی ہے اور آج بھی پیدا کی جا رہی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اسلام میں کثیر العناصر معاشرے کا کوئی تصور موجود نہیں ہے یعنی اسلام کسی Pluralistic Society کا تصور اپنے اندر نہیں رکھتا۔ بلکہ ان حضرات کے خیال میں اسلام اپنے فکر و عمل اور تاریخی تجربے کے اعتبار سے ایک خالص یک عنصری معاشرہ (Monolithic Society) رکھتا ہے جس میں صرف

سمجھتی کہ دین پر عمل نہیں کر رہا' یوں شیطان کو موقع مل جاتا' وہ حکمران کو ایک وادی میں لے جاتا اور رعایا کو دوسری وادی میں۔

ممکن تھا کہ ہمیں بھی فرقہ واریت کا سامنا کرنا پڑتا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہمارا معاشرہ' پارٹی بازی اور گروہ بندی کا شکار ہو کر بٹ جاتا۔ ایک طرف پیشہ ورانہ عصبیت ہوتی تو دوسری طرف مذہبی و سیاسی فرقہ بندی۔ ایک طرف فوجی ہوتے تو دوسری طرف شہری۔ میرا یہ دعویٰ نہیں کہ ہم فرقہ واریت سے سو فی صد "پاک" ہو چکے ہیں۔ تاہم میرا اپنا ایک خاص نقطہ نظر ہے کہ اگر تحریک اسلامی کو فرقہ واریت کا سامنا کرنا پڑے تو اسے اپنے دروازے آنے والوں کے لیے بند نہیں کر لینے چاہییں۔ آنے والوں سے ہم یہ نہیں کہتے' نہ کہہ سکتے ہیں کہ اب جب کہ اللہ کی نصرت و فتح آ چکی ہے' تم لوگ گروہ در گروہ منہ اٹھائے چلے آ رہے ہو۔ تم لوگ مخلص نہیں ہو بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے منافقوں کی مانند ہو۔ تحریک اسلامی کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کی اوچھی حرکتوں سے باز رہے ورنہ وہ اصولوں پر قائم تحریک کے بجائے ظاہری دین داری کی ایک بھونڈی شکل بن کے رہ جائے گی۔

سوڈان میں دین کے غلبے سے قبل یہ سارے اندیشے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک اسلامی نے قوم کے تمام شعبوں میں نفوذ کا فیصلہ کیا کہ مبادا وہ صرف قوم کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے تک محدود ہو کر رہ جائے' یا عورتوں کے بجائے صرف مردوں میں ہی پھیلے' یا شہری آبادی میں تو کام کرے اور دیہاتی آبادی کو نظرانداز کر دے' یا جوانوں کو اپنائے اور بوڑھوں سے صرف نظر کرے۔ ہم نے چاہا کہ تحریک اسلامی' امیروں' غریبوں' مردوں سب کو اپنے دامن میں لے تاکہ ملک میں توازن قائم ہو اور عصبیت سر نہ اٹھائے۔ الحمدللہ' ہماری اس منصوبہ بندی سے بہت فائدہ ہوا۔ اگر ہم نے یہ احتیاط نہ کی ہوتی تو ہم بھی فتنے سے دوچار ہو جاتے۔

س: آج سے ربع صدی قبل آپ نے فکر اسلامی میں تجدید کی دعوت دی تھی اور فقہ اسلامی کے اصولوں پر نظرثانی کا مطالبہ کیا تھا۔ اب آپ عملاً اسلامی نظام نافذ کر چکے ہیں تو اس سلسلے میں کیا پیش رفت کر پائے ہیں؟

ج: ایسا نہیں ہوا کہ ہمارا یہ تجربہ منتخب مجددین کا مخصوص مذہب بن کے رہ گیا ہو جو عوام سے الگ تھلگ اور کٹے ہوئے ہوں۔ دین میں عمل تجدید جاری و ساری رہتا ہے۔ اس بدیہی حقیقت سے ہمارے عوام تک واقف ہو چکے ہیں۔ وہ جان چکے ہیں کہ دین حرکت کا نام ہے۔ یہ قدم بہ قدم اور روز بروز ترقی و پیش قدمی کا نام ہے۔ دین نت نئے پیش آمدہ مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ ہمارے عوام یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اسلام اپنے دامن میں جدت و وسعت لیے ہوئے ہے۔

ہمارا ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ ہماری تحریک کی سرپرستی مجتہد علما کا ایک مختصر گروہ کر رہا ہے جو کلیسا کے پادریوں کی طرح ہیں۔ اگرچہ مذہبی پیشواؤں پر اندھا دھند اعتماد کی یہ بیماری' اہل مغرب کی طرح مسلمانوں کو

بھی لگ چکی ہے تاہم' اللہ کا شکر ہے کہ سوڈان میں اجتہاد پورے معاشرے کی تحریک بن چکا ہے۔ سوڈان کا ہر مسلم شہری اجتہاد میں اپنا حصہ لے رہا ہے اور اپنی علمی استعداد کے مطابق ہمارے ساتھ تعاون کر رہا ہے اور دین اسلام کے عملی نفاذ کا مطالعہ کر رہا ہے۔ کتابوں میں درج قیاس' اجماع' بلکہ کتابوں کی زیادہ تر باتیں ہی بہت پیچھے رہ گئی ہیں۔

سب جانتے ہیں کہ اجماع نام ہے امت کی رائے کا یعنی جس بات پر امت متفق ہو جائے' اس امت کے عالم اور جاہل سب کے سب۔ یہ الگ بات ہے کہ باہمی مشورے میں علما زیر بحث مسئلے پر جس قدر روشنی ڈال سکتے ہیں جاہل اس قدر نہیں۔ تاہم علما عوام سے گھلتے ملتے ہیں اور ان کے تقاضوں اور ضرورتوں کا ضرور خیال کرتے ہیں۔

ہم قرآن شریف کا مطالعہ کس طرح کریں؟ اس کی تفسیر کیسے کریں؟ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کی سنت کا مطالعہ کس طرح کریں؟ یاد رہے کہ لفظ "سنت" سے ہماری مراد صرف "حدیث رسولؐ" نہیں ہوتی بلکہ سنت سے ہماری مراد عہد نبویؐ کے تمام نمونے ہیں۔ قرآن کی راہنمائی میں نبی اکرمؐ نے اپنے صحابہ کے ساتھ مل کر یہ عملی نمونے پیش کیے۔ حضورؐ صحابہؓ کی رہنمائی فرماتے تھے۔ ان کی تصحیح کرتے تھے ان کی رائے اگر غلط ہوتی تو اس کو درست فرما دیتے جب کہ حضورؐ اور صحابہؓ کی رہنمائی و درستی' قرآن کرتا تھا۔

سوڈان میں نفاذ اسلام کے بعد لفظوں اور اصطلاحات کا مفہوم تبدیل ہو چکا ہے۔ فقہ "متخصصین" کا معاملہ نہیں رہی کہ وہی اس پر آخری سند ہوں۔ اب "فقہ" سب عوام کے لیے ہے۔ اگر ایک ماہر علوم کائنات' سائنس دان گہرائی سے کام لیتا ہے اور اپنے اس علم کو دین کی خدمت کے لیے استعمال کرتا ہے تو ہماری نظر میں وہ "فقیہ" ہے۔ ہمارے یہاں دین اور زندگی سب ایک ہیں' ان میں یکسانیت ہے اور وحدت ہے۔ ہمارے یہاں دین و مذہب کے لیے الگ وزارت نہیں۔ یہاں عبادات و معاملات میں فرق نہیں ہے' ساری زندگی ہی معاملہ ہے اور ساری زندگی ہی عبادت ہے۔ ہم عبادت و معاملہ میں تفریق کے قائل نہیں ہیں۔ اجتہاد سب کے لیے ہے۔ اگرچہ ان کے اجتہاد کے درجے و مرتبے میں تفاوت ہو گا مگر وہ سب باہم مشورے کے لیے اپنی اجتہادی قوتوں کو یکجا کریں گے۔ انھیں ایک نقطہ پر مرکوز کریں گے خواہ اجماع جامع ہو یا محلی و مقامی۔ ہم کتب اصول میں کئی باتیں پڑھا کرتے تھے۔ یہ کتابیں بانجھ ہو چکی تھیں اب از سرنو عام لوگوں کے لیے مفید ثابت ہو رہی ہیں۔ یہ اب تعلیم یافتہ طبقے کی تعلیم کا حصہ بن چکی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔

س : اس صدی کے آغاز سے لے کر نوے کی دہائی تک تحریک اسلامی کو مختلف دھاروں سے گزرنا پڑا ہے؟ تاہم

اگلی صدی تک پہنچنے کے لیے ابھی کرنے کا بہت کچھ کام باقی ہے۔ اسلامی تحریکوں کو درپیش مستقبل کے چیلنج کیا ہیں؟ اور ان کے راستے میں کیا رکاوٹیں ہیں؟

ج: اسلامی تحریکیں دراصل ایک طویل جمود و تعطل کے بعد معرض وجود اور حرکت میں آئی ہیں' مگر المیہ یہ ہوا کہ ان میں سے کچھ تحریکوں نے چند قدم چلنے کے بعد ہی اپنی معمولی یافت پر تکیہ کر لیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ ابھی تک ماضی کے بوجھ اپنی پیٹھ پر اٹھائے ہوئے کراہ رہی ہیں' وہ مڑ مڑ کر اپنی ماضی کی کارکردگی کی طرف دیکھتی ہیں مگر ان کی نظریں اپنے مستقبل سے چوک جاتی ہیں۔ وہ مستقبل سے لاپروا ہیں اور اس کے بارے میں خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔۔۔ مسلمان کی نظر آخرت پر ہوتی ہے۔ وہ اپنی پوری زندگی کی منصوبہ بندی آخرت کے لیے کرتا ہے۔ وہ نقد نفع اور کمائی سے قطع نظر اپنی پوری زندگی جدوجہد میں گزار دیتا ہے بلکہ وہ نفع ملنے کی توقع آخرت میں رکھتا ہے۔ اس کی نمایاں مثال شہید ہے۔ اسلامی تحریکیں اپنے مستقبل کی صحیح منصوبہ بندی نہیں کر پائیں۔ یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ کچھ لوگ اسلامی تحریکوں میں رہیں تو اپنی ذات تک' اپنی دنیا تک محدود رہیں' مستقبل سے بے گانہ رہیں اور اگر اسلامی تحریکوں سے نکل کر کسی اور پارٹی میں شامل ہوں تو منصوبہ بندی کریں اور اپنی حکمت عملی وضع کریں۔

سوڈان کی اسلامی تحریک نے اسّی کے عشرے سے اپنی ہر سال کی مکمل منصوبہ بندی کرنی شروع کی' اخراجات کے لحاظ سے' حصول مقاصد اور ذمے داریوں کی ادائیگی کے لحاظ سے۔ سالانہ منصوبہ بندی کے بعد اس نے اعلیٰ اہداف کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ اس نے رحمت الٰہی پر انحصار کیا۔ وہ اہداف جو سوڈان جیسے ملک میں ہمیں بہت دور معلوم ہوتے تھے' بفضل الٰہی نزدیک آنے لگے۔ یہ تھا ہماری تحریک کا اسلوب و طریق کار۔ یوں ہماری مستقلاً" منصوبہ بندی ہونے لگی۔

آپ نے آیندہ صدی کی بات ہے۔ اگر ہم نے ہر روز' ہر ماہ اور ہر سال کے لیے منصوبہ بندی کر رکھی ہے تو پھر ہمیں اکیسویں صدی میں داخل ہونے میں کوئی دشواری نہ ہو گی۔ اسلام تو ہمیں منصوبہ بندی کا درس دیتا ہے' دیکھیے نماز فجر ہمارے لیے منصوبہ ہے۔ نماز عشا ہمارے لیے محاسبہ ہے۔ ایک نماز جمعہ سے دوسری نماز جمعہ تک ایک منصوبہ بندی ہے۔ ایک ماہ رمضان سے دوسرے ماہ رمضان تک بھی ایک منصوبہ ہے۔ گویا انسان کے لیے اس کی عبادات' اس کے سب معاملات اس کے لیے باقاعدہ منصوبے ہیں۔ اب الحمدللہ ہماری تحریک کا منصوبہ پوری زندگی پر محیط ہے۔

ہمارے اردگرد جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے ہم اس سے آگاہ ہیں۔ آج پوری دنیا ایک صحن خانہ بن چکی ہے۔ لہٰذا ہم یہ نہیں چاہتے کہ اہل مغرب ہم پر یہ الزام لگائیں کہ ہم اسلام کو بزور شمشیر پھیلانا چاہتے ہیں یا ہم پر یہ تہمت لگائیں کہ ہم دہشت گردی اور بنیاد پرستی کے ذریعے اسلام کو توسیع دینا چاہتے ہیں۔

ہمارا ارادہ یہ ہے کہ ہم اپنے اس علاقے میں اپنے اس دور میں' قومی زندگی کے تمام گوشوں میں اور آیندہ برسوں کے تمام مراحل کے دوران اپنی سرگرمیوں کی باقاعدہ منصوبہ بندی کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی بیداری پورے عالم اسلام میں پھیلنے والی ہے' اس لیے کل صلاحیتوں اور استعداد عمل کو مخصوص اہداف کے حصول کے لیے باقاعدہ منظم طور پر' بر از حکمت اسلوب میں بروئے کار لانے کی منصوبہ بندی کرنے کی ضرورت ہے۔

اب اسلامی قیادت کو اپنے علم' اپنی مستعدی' اپنی سرگرمی' اپنی بیداری اور اپنی بیدار مغزی میں سب سے نمایاں ہونا چاہیے' خواہ یہ مسلم تحریکیں ہو یا مسلم معاشروں کے ذرائع اطلاعات و معلومات ہوں۔ اسلامی قیادتیں اور مسلم ذرائع ابلاغ جو کچھ امت اسلامیہ کے لیے پیش کر رہے ہیں وہ بہت کم ہے۔ انھیں جس حد تک امت مسلمہ اور انسانیت کو درپیش خطرات سے باخبر رکھنا چاہیے' وہ نہیں کر رہے۔

میرے خیال میں یہ سب سے بڑا چیلنج ہے اس لیے کہ دنیا اب قومی اور وطنی تعصبات سے کنارہ کش ہو چکی ہے۔ ان تعصبات نے عوام کو ہم سے دور کر دیا تھا اور عوام کے کان ہماری آواز سننے سے محروم تھے۔ مغرب میں سرمایہ داری اور اشتراکیت کی کش مکش ختم ہو چکی ہے۔ مغرب و مشرق نے اس سے نجات پالی ہے۔ اشتراکیت تو تقریباً مٹ چکی ہے چنانچہ اب دنیا کے مختلف ممالک میں قائم سیاسی پارٹیاں کسی مخصوص روایتی منشور کے بغیر کام کر رہی ہیں۔ مغرب میں لامذہب' مذہب بن چکا ہے گویا مغرب اب مذہب سے فارغ ہو چکا ہے۔ اب دنیاوی خواہشات تو عقائد اور باقاعدہ مذاہب کو تشکیل نہیں کر سکتیں۔

ہم پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ ممالک کے لوگ جو مغرب کے محب بلکہ پرستار ہیں' ہم بھی مغرب سے متاثر ہو کر تعصبات کا شکار ہو گئے۔ ہمارے یہاں بھی ملکی' علاقائی اور صوبائی عصبیتوں نے سر اٹھایا۔ مغرب کی اس پیروی سے ہمیں سخت نقصان پہنچا۔ ہم خود ہی بھٹکنے لگے۔ جب لوگ بھٹک رہے ہوں' گم گشتہ راہ ہوں تو کسی لیڈر کے لیے ان کی راہنمائی آسان ہو جاتی ہے۔ وہ انھیں آسانی کے ساتھ صراط مستقیم پر چلا سکتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ چل پڑتے ہیں۔ انسانی تاریخ کا مطالعہ بہت ضروری ہے تاکہ ہم درپیش چیلنجوں کو جان سکیں۔ اب تو مشرق و مغرب کی مقابلہ آرائیوں کے بعد اسلام خود ایک مقصود بن چکا ہے اس لیے کہ اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض سے نہ ہٹائے تو زمین میں فساد ہونے لگے۔

ایک مسلمان کی آرزو ہوتی ہے کہ وہ مبشر بنے' وہ مسلمانوں کو بشارت دے کہ ان کا میدان عمل بہت وسیع و عریض ہے۔ اب تو کرہ ارض ایک نشیبی وادی کی طرح بن چکا ہے جس میں نشیب کی طرف پانی تیزی سے بہہ جاتا ہے۔ اتصال اور رابطے کے لحاظ سے کرہ ارض کی یہ حالت ہے تو مسلمانوں پر کچھ ہوائیں بھی آئیں گی اور ممکن ہے کہ پانی بھی ان تک آ پہنچے۔

س: نوے کی دہائی کے خاتمے کے ساتھ ہی بہت سی اسلامی تحریکیں' مختلف طریقوں سے مسند اقتدار تک پہنچی ہیں۔ جمہوریت کے راستے سے' جیسے ترکی میں رفاہ پارٹی' کئی انقلاب کے ذریعے برسراقتدار آئیں جیسے سوڈان میں ہوا۔ بعض پارٹیوں نے بیلٹ بکس کے ذریعے اقتدار پانے کی کوشش کی مگر وہ اس منزل تک نہ پہنچ پائیں۔ کیا اقتدار پانے کے لیے کچھ مثالی اعلیٰ طریقے ہیں؟ یا یہ ہر ملک' علاقے یا براعظم کی کچھ مقامی خصوصیت ہوا کرتی ہے؟ کیا اسلام کی سیاسی تحریکوں کے لیے روا ہے کہ اگر وہ بیلٹ بکس کے ذریعے برسراقتدار نہ آسکتی ہوں تو وہ اس مقصد کے لیے اسلحہ استعمال کریں؟

ج: تہذیبی تبدیلیاں بالعموم اسی وقت ظہور پذیر ہوتی ہیں جب انسان اپنی جملہ صلاحیتوں اور طاقتوں کو بروئے کار لا چکا ہوتا ہے۔ ایسا محض اس کی جدلی صلاحیتوں کے اظہار سے نہیں ہوتا بلکہ ضروری ہے کہ اس کی جملہ فکری' جدلی اور جہادی صلاحیتیں یکجا ہوں تاکہ تہذیبی تغیرات رونما ہوں۔ یہی پوری دنیا کی تاریخ ہے۔ جمہوریت کی تاریخ بھی اس سے الگ نہیں ہے۔ جمہوریت بھی کسی ملک میں نرمی و آسانی اور مرحلہ وار نہیں آئی۔ سب تبدیلیاں انقلاب سے آئی ہیں حتیٰ کہ عادلانہ اقتصادی تبدیلیاں بھی بذریعہ انقلاب آئی ہیں۔ یہی حال دینی انقلابوں کا ہے۔ قرآن اس بارے میں بالکل واضح ہے۔ اس نے ہمیں حکم دیا ہے کہ لوگوں کے سامنے احسن طریقہ سے دینی تعلیمات پیش کریں۔ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (النحل ۱۶:۱۲۵)' "اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو"۔ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ (بنی اسرائیل ۱۷:۸۴)' "اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہہ دو کہ ہر شخص اپنے طریقے پر عمل کر رہا ہے"۔ "اَنُلْزِمُكُمُوْهَا؟" (ھود ۱۱:۲۸) "پھر کیا ہم اس کو (زبردستی) تمھارے گلے مڑھ دیں؟" نہیں! نہ ہم اسے تمھارے گلے مڑھیں اور نہ تم اسے ہمارے گلے مڑھو۔ قرآن بتاتا ہے کہ جب انھیں معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ حق پرستوں کے مفاد میں حرکت کرنے والی ہے تو وہ بزور قوت ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ دھمکی دیتے ہیں: لنخرجنک من دیارنا ہم تمھیں اپنے ملک سے نکال باہر کریں گے۔ کبھی قتل کی دھمکی دیتے ہوئے کہا جاتا ہے: لَاَقْتُلَنَّكَ میں تمھیں مار ڈالوں گا۔

اجتہادی طاقتوں کے ساتھ جہادی قوتوں کی بھی ضرورت ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے اور مانا ہوا اصول ہے۔ مسلمانوں نے نظام اسلام کے نفاذ کے لیے جمہوریت کا راستہ اپنایا' طاغوتی قوتوں کو مسلمانوں کی جمہوریت بھی پسند نہ آئی۔ اس جمہوریت سے یورپی قوتوں کو اپنے مفادات خطرے میں نظر آ رہے تھے۔ جمہوریت کے انھی نام لیواؤں نے مسلمانوں کی جمہوری جیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

محض قتال سے بھی کام نہیں چلے گا۔ ضروری ہے کہ آپ سب طاقتوں کو یکجا کریں۔ اجتہاد اور جہاد دونوں قوتوں کو اکٹھا کریں۔ افغانستان میں جہاد کی قوت استعمال ہوئی۔ دس لاکھ سے زائد مجاہدین شہید ہو

گئے۔ محض جہاد سے وہ اپنے مقصد عالی میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اگرچہ انھوں نے اپنے جہاد سے باطل کے باطل ہونے کو واضح کر دیا، مگر وہ حق کو حق ثابت کرنے میں ناکام رہے۔ فطرت خلا نہیں رہنے دیتی۔ باطل نابود ہو رہا ہو اور آپ اس کی جگہ لینے کے لیے آمادہ نہ ہوں یا آپ کو معلوم ہی نہ ہو کہ حق کو کیسے نافذ و سربلند کرنا ہے؟ حق کی کس طرح حفاظت کرنی ہے، تو پھر اس نابود باطل کی جگہ پر کرنے کے لیے کوئی اور باطل آ جائے گا۔ جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اقتدار کی منزل تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے؟ --- اسلام کہتا ہے کہ جہاد سے ابتدا نہ کی جائے بلکہ دعوت و اجتہاد سے آغاز کار کیا جائے۔ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَآتُوا الزَّكَوٰةَ (النساء ۴:۷۷)، "جنگ سے اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو"۔ اپنے عمل و کردار کے اعلیٰ نمونے قائم کرو۔ ایک دن آئے گا جب تم صف بستہ ہو جاؤ گے اور دشمن کے لیے تمھارا مقابلہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہے گا کہ تم جلد ہی اس پر جھپٹنے والے ہو۔ جب دشمن اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ تم پر حملہ آور ہو تو اس وقت تمھارا تیار ہونا بھی ضروری ہے۔ اب قوت کا مقابلہ قوت سے کرنا ہو گا۔ بحث و مجادلہ کرنے والوں سے مجادلہ اور لڑائی کرنے والوں سے لڑائی لڑنی پڑے گی۔

ہر ملک کی اپنی ایک منفرد تاریخ اور اپنا ایک مخصوص مزاج ہوا کرتا ہے۔ اس کے مطابق تحریک اسلامی کے لیے اس ملک میں ابتلا و آزمایش کے درجے مختلف ہوا کرتے ہیں۔ بعض اوقات ایک ملک کا ڈھانچہ اس طرح کا ہوتا ہے کہ وہاں پہلے کبھی اسلامی نظام قائم نہیں ہوا تھا، وہاں اسلام کمزور ہوتا ہے۔ وہاں نظام اسلام کے قیام کے لیے بہترین حکمت عملی یہ ہے کہ وہاں نفاذ اسلام کی کوششیں بتدریج اور دھیرے دھیرے کی جائیں۔ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ (طٰہٰ ۲۰:۴۴) "نرمی سے بات کرنا شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے"۔

عوام اور حکومت کے مابین تعلق و رابطہ اور باہمی تعامل ہر ملک میں مختلف النوع ہوا کرتا ہے۔ کسی ملک میں عوام حکمرانوں کے قریب ہوتے ہیں۔ کہیں حکمران خاموش رہ کر اپنے عوام کی خیر خواہی میں مصروف رہتے ہیں۔ کسی ملک میں یہ ہوتا ہے کہ عوام کسی وادی میں سرگرداں ہیں تو حکمران کسی وادی میں ہیں۔ کسی ملک کے حکمران اپنے مزاج اور افتاد طبع کے لحاظ سے، عوام میں سے سرکردہ لوگوں کو اپنا مقرب خاص بنا لیتے ہیں۔ غرضیکہ ہر ملک کی اسلامی تحریک کو اپنے ملک کے حالات، اس کے کلچر، اس کے ماضی اور حکمرانوں کے رویے کو سامنے رکھ کر پورے غور و خوض کے بعد اپنے لیے حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ تاریخ کے قوانین، قرآن اور انسانی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے کافی ہیں۔

س: انتہا پسندی اور اپنے مقصد سے سچی لگن کے مابین کس طرح توازن قائم کیا جا سکتا ہے؟

ج: ہم انتہا پسندی کی اصطلاح استعمال نہیں کرتے۔ یہ ایک مغربی اصطلاح ہے۔ اہل مغرب اپنے آپ کو دنیا کا مرکز و محور سمجھتے ہیں مگر فی الحقیقت دنیا کا مرکز وہ نہیں، ہم ہیں، اس لیے کہ ہم دنیا کے وسط میں ہیں۔ ہم امت وسط ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جغرافیائی اور مذہبی لحاظ سے امت وسط بنایا ہے تاکہ ہم گواہ بن سکیں، اپنے سے مشرق، مغرب، شمال اور جنوب والوں پر۔ یہ تو ہوا جغرافیائی لحاظ سے۔ ہم امت معتدل ہیں، اقتصادی و مالی لحاظ سے اپنے سے کم حیثیت والوں کے لیے۔ ہم فتنہ مال و جمال اور فتنہ حکومت و اقتدار بلکہ سب فتنوں سے بچنے میں لوگوں کے لیے راہ اعتدال پر قائم رہنے میں نمونہ ہیں۔ اہل مغرب اپنے آپ کو مرکز عالم گردانتے ہیں اور اپنے سے دوری اختیار کرنے والوں کو "انتہا پسند" کا لقب دیتے ہیں۔ آپ جتنے زیادہ دین دار ہوں گے اہل مغرب کی نظر میں آپ اتنے ہی بڑے انتہا پسند ہوں گے۔ ہم انتہا پسند کا لفظ استعمال نہیں کرتے بلکہ اس کی جگہ "حدود فراموش" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ آپ حد مطلوب سے بڑھنے کی کوشش کریں۔

جیسے ایک نوجوان عالم شباب میں کچھ زیادہ ہی طرار ہوتا ہے، جلد بازی کا مظاہرہ کرتا ہے، اپنے والدین کی سرپرستی سے آزاد ہونے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔ اپنے ماں باپ کے فریم ورک سے نکلنا چاہتا ہے۔ اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتا ہے حالانکہ بسااوقات اس کی یہ پسند غیر معقول ہوتی ہے۔ یہی حال بعض اوقات تحریک اسلامی کا ہوا کرتا ہے۔ وہ جذباتی رویہ اختیار کرتی ہے۔ ہر جدید پر فریفتہ ہوتی ہے۔ تحریک اسلامی جب حالات سے متصادم ہوتی ہے تو اس کا ردعمل بہت شدید ہوتا ہے۔ وہ حد مطلوب سے تجاوز کر جاتی ہے۔ وہ درگزر کو فراموش کر دیتی ہے۔ حالانکہ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ (الشوریٰ ۴۲:۳۷) "وہ بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصہ آ جائے تو درگزر کر جاتے ہیں"۔ تحریک کے افراد توکل نہیں کرتے حالانکہ حکم ہے لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (الشوریٰ ۴۲:۳۶) "وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں"۔

بعض اوقات ہمارا ردعمل ایک فطری امر ہوا کرتا ہے۔ اگر فریق مخالف دست درازی کرتا ہے، بدزبانی کرتا ہے، اپنی قوت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے لیے جیلوں کے دروازے کھول دیتا ہے تاکہ مجھے دبائے اور چپ کرائے تو میں ان حالات میں ضرور اس کا مقابلہ کروں گا۔ میرا یہ ردعمل جائز اور فطری ہوگا۔

آپ مصروف جدوجہد ہوں اور اہل مغرب آپ کو پسند کرتے ہوں تو وہ آپ کو "جنگجو، حریت پسند" کہیں گے اور اگر انھیں آپ کے مقصد سے اختلاف ہے اور وہ آپ کو ناپسند کرتے ہیں تو پھر وہ آپ کو

ہم منتقلی کے مرحلے میں ہیں۔ پورا عالم اسلام' مرحلہ انتقال سے گزر رہا ہے۔ اسلام کی تعمیر نو کی خاطر' بیداری اور تجدید عمل کی سخت ضرورت ہے۔ ہمیں دین کے اقتدار کا انتظار کرنا ہے۔ اعتدال سے کام لینا ہے۔ یہاں اعتدال سے میری مراد سکوت و بے عملی ہرگز نہیں ہے۔

س: مغرب کے ساتھ مکالمے کے بارے میں اسلامی حلقوں میں دو متضاد رائیں پائی جاتی ہیں۔ دونوں کے اپنے دلائل ہیں۔ کچھ لوگ مغرب سے مکالمے کے حق میں ہیں کچھ دوسرے اس کے خلاف ہیں' وہ اسے تہذیبی تصادم قرار دیتے ہیں۔ اکثریت اس بارے میں متذبذب ہے۔ آپ کا موقف کیا ہے؟

ج: ہم تو اہل مغرب سے مکالمے کے حق میں ہیں۔ وہ ابتدا نہیں کرتے تو ہم خود پہل کریں گے۔ مکالمے کی ابتدا کرنا آپ کا فرض ہے۔ آپ انھیں دعوت دیں' انھیں خبردار کریں' انھیں خوشخبری دیں۔ اس لیے کہ ہم ان کے مذہب' ان کی زبان اور ان کی تاریخ سے واقف ہیں جب کہ وہ ہمارے دین' ہماری زبان اور تاریخ سے کماحقہ' آشنا نہیں ہیں۔ ہم امتیازی اوصاف کے حامل ہیں۔ ہم مکالمے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں۔ ان کے پاس یہ سب کچھ نہیں۔ لہٰذا ہم ان سے مکالمہ و مذاکرہ ضرور کریں گے۔ اس میں پہل کریں گے۔

تصادم میں ضروری ہوتا ہے کہ آپ پہل کاری کریں۔ ہمارے لیے روا نہیں کہ ہم کسی پر زیادتی کریں۔ ہاں جب کوئی ہم پر زیادتی کرے گا تو پھر ہم دیکھیں گے کہ آیا اس کی زیادتی سے ہمیں کوئی بڑا خطرہ ہے یا نہیں۔ اگر بڑا خطرہ نہیں ہے تو پھر ہم درگزر کریں گے۔ ہم نصرانیت کے بقول---- اس کے سامنے اپنا دوسرا گال بھی کر دیں گے۔ اگرچہ یہ عیسائیت کا نظری عقیدہ ہے۔ اس پر ان کا عمل نہیں ہے۔

آپ کو کوئی تھپڑ مارے تو آپ کو اسے معاف کرنے یا اپنا دفاع کرنے کا اختیار ہے۔ یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے مگر ہم تو اسلامی وجود کے محافظ ہیں۔ ہم پر کوئی حملہ کرتا ہے تو ہم سوچ سمجھ کر حملہ آور کے خلاف اقدام کا فیصلہ کریں گے۔ اور یہ طے کریں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟ مکالمہ یا جہاد' مذاکرہ یا مقابلہ؟ آپ نے اپنے سوال میں جسے تضاد قرار دیا ہے' میں اسے تضاد نہیں سمجھتا' نہ میں اسے تذبذب سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ ہم میں سے ہر شخص اہل مغرب سے مکالمے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی صاحب ان سے ان کی عقلی سطح کے مطابق' ان کی زبان میں ان سے مکالمہ کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں' اور ایسا کرنا مناسب سمجھتے ہوں۔ اور ممکن ہے کہ کوئی اور صاحب یا کوئی گروہ اپنے اندر میدان جہاد و قتال میں اہل مغرب سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت پاتا ہے اور اسے زیادہ کارگر سمجھتا ہے۔ یہ صلاحیتوں' موقع محل اور وقت کی بات ہوا کرتی ہے۔

ہم سب کو یک جان ہو کر متفقہ پروگرام کے مطابق قدم اٹھانا ہو گا' یا مکالمہ یا جہاد' کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو گا اور اس سے پہلے ہمیں اپنی تکمیل کر لینی چاہیے۔ ہمیں میدان قتال میں بھی سوچ سمجھ اور تفقہ

سے کام لینا ہو گا۔ "وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوٓا اِلَيْهِمْ" (التوبہ ۹:۱۲۲) "اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ (غیر مسلمانہ روش سے) پرہیز کرتے"۔

حتیٰ کہ ہم جس کے خلاف لڑائی کر رہے ہوتے ہیں اسے قتل کرنا بھی ہمارا اصل مقصد نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ ہمیں اس شخص سے ذاتی عداوت نہیں ہوتی۔ ہم تو اس نظام سے برسرپیکار ہوتے ہیں جس کے تحفظ کے لیے وہ شخص میدان جنگ میں اترتا ہے۔ ہم اسلحہ اٹھاتے ہیں تاکہ اس شخص کے قبول اسلام کے راستے میں حائل رکاوٹوں کو دور کر دیں۔ لوگوں کے سینوں کو، شہروں کو اسلحے سے فتح کر لینا کوئی کمال نہیں، بہترین فتح تو انسانوں کے سینوں کو ہدایت سے فتح کرنا ہے۔ علاقوں کو نور اسلام سے فتح کرنا ہے۔

مذاکرات مقاصد جہاد میں شامل ہیں۔ جہاد کے لیے تیاری ضروری ہے۔ اگر دشمن کو یقین ہو کہ آپ اس کے خلاف میدان جنگ میں جہاد نہیں کریں گے تو وہ کبھی آپ کے ساتھ مذاکرات کی میز پر بیٹھنے کے لیے آمادہ نہ ہو گا۔

تعمیر سیرت ماڈل کالج، منصورہ، لاہور

نوٹس داخلہ

آرٹس ۔ جنرل سائنس ۔ شریعہ ۔ کامرس (آئی کام، سی کام) ڈی۔بی۔اے، ڈی۔سی۔ایس

☆ محکمہ تعلیم پنجاب سے منظور شدہ ۔ ٹیکنیکل بورڈ اور لاہور بورڈ سے الحاق شدہ۔

☆ لازمی دینی تعلیم و تربیت ۔ ☆ فیسوں کا رعایتی پیکج ۔ ☆ ہاسٹل کی سہولت۔

☆ بہترین نتائج

داخلہ فارم جمع کروانے کی آخری تاریخ 15 اگست 1997

پرنسپل

فرید احمد پراچہ

تعمیر سیرت ماڈل کالج منصورہ، ملتان روڈ، لاہور - 54780

فون : 7832741، فیکس : 7831467